ગુજરાત રાજ્યના શિક્ષણવિભાગના પત્ર-ક્રમાંક
મશબ / 1215 / 170-179 / છ, તા. 4-3-2016 થી મંજૂર

اُردو

جماعت 11

ઉર્દૂ ધોરણ 11

بھارت میرا وطن ہے۔
تمام بھارتی میرے بھائی بہن ہیں۔
میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور اس کے شاندار بوقلموں ورثے پر فخر کرتا ہوں۔
میں ہمیشہ اس کے شایان شان بننے کی کوشش کرتا رہوں گا۔
میں اپنے والدین، اساتذہ اور بزرگوں کی تعظیم کروں گا
اور ہر شخص کے ساتھ ادب سے پیش آؤں گا۔
میں اپنے وطن اور اہلِ وطن کو اپنی عقیدت پیش کرتا ہوں۔
ان کی فلاح وبہبودی میں ہی میری خوشی ہے۔

રાજ્ય સરકારની વિનામૂલ્યે યોજના હેઠળનું પુસ્તક

گجرات راجیہ شالا پاٹھیہ پستک منڈل
'ودیاین'، سیکٹر-10-A، گاندھی نگر-382010
तमसो मा ज्योतिर्गमय

© گجرات راجیہ شالا پاٹھیہ پستک منڈل، گاندھی نگر
اس درسی کتاب کے جملہ حقوق بحق گجرات راجیہ شالا پاٹھیہ پستک منڈل محفوظ ہیں۔ اس درسی کتاب کے کسی بھی حصہ کو کسی بھی صورت میں گجرات راجیہ شالا پاٹھیہ پستک منڈل کے ڈائرکٹر کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جا سکتا۔

مشیر مضمون

جناب ایم۔جی۔بمبئی والا

تصنیف - تالیف

جناب شیخ اختر شاہ

جناب غلام فرید شیخ

محترمہ ناظمہ انصاری

محترمہ نسیم اختر

محترمہ شاہینہ بانو قادری

تبصرہ

محترمہ قاضی شریف النساء

ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری

جناب عمر جی محمد یعقوب

جناب محمد جنید ماکنوجیا

محترمہ شبانہ بانو سیّد

جناب محمد نعیم

تصاویر

تابش گرافکس

اشاعت ترتیب

شری ہرین پی. شاہ

(منڈل کے نائب دائریکٹر، اکیڈمک)

طباعت ترتیب

شری ہریش ایس لمباچیا

(منڈل کے نائب ڈائریکٹر- پروڈکشن)

پیش لفظ

این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے ذریعے تیارکردہ نئے قومی نصاب کے ضمن میں گجرات سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ، گاندھی نگر نے ریاست کے سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری درجات کے مختلف مضامین کے نئے نصاب تیار کیے ہیں جو حکومت گجرات کے تعلیمی شعبے کے ذریعے منظور کیے گئے ہیں۔

نئے قومی نصاب کے پس منظر میں تیارکردہ ریاست کے الگ الگ مضامین کے نئے نصاب کے مطابق تیار کردہ جماعت-11 اردو (مادری زبان) کی اس درسی کتاب کو اس سطح پر تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے۔

تصنیف و ترتیب کی پینل کے اراکین نے اس درسی کتاب کے مسوّدے کی تشکیل کے عمل میں ہر بات کا پورا خیال رکھا ہے۔ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ نیز دیگر ریاستوں کے کورس، سِلیبَس، اور درسی کتابوں کے معائنہ-جانچ کرنے کے بعد ریاست کی درسی کتابوں کو مزید صفات آمیز بنانے کے لیے مصنفین اور مرتبین نے کافی زحمت اٹھائی ہے۔

اس درسی کتاب کو شائع کرنے سے قبل اُس کے مسوّدے پر تعلیمی کارگزاری انجام دینے والے مدرّسین-ماہرین کے ذریعے کلّی طور پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ تبصرے میں تجویزکردہ ترمیم و اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ نیز متعلّقہ منظوری کے عمل کے دوران گجرات سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری بورڈ، گاندھی نگر کا جانچ احوال حاصل ہونے کے بعد ترمیم اور اضافہ کر کے اس درسی کتاب کو تیار کی گئی ہے۔

طلبہ روزمرّہ میں زبان کا استعمال کرنے لگیں اور لسانی اظہار کو مزید مؤثر بنائیں یہی نئے نصاب کا مقصد ہے۔ ادبی اصناف اور تخلیقی زبان کے فروغ کے ہمراہ طلبہ زبان کی خوبیوں کو سمجھ کر اُن کا تحریری کام میں استعمال کریں یہ بھی ایک مقصود ہے۔ اس کے لیے لسانی اظہار نیز تحریر سے متعلق خاطر خواہ تفصیلات بھی دی گئیں ہیں اُن کے متعلق طلبہ کو مشق کرائیے۔

زیر نظر درسی کتاب کو دلچسپ، کارآمد اور خامیوں سے پاک بنانے کے لیے پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ تاہم تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے ذریعے حاصل ہونے والے اس درسی کتاب کی صفات میں اضافہ کرنے والے مشورے ہمیشہ قابل قبول ہوں گے۔

پی۔ بھارتی (IAS)
ڈائریکٹر
تاریخ : 21-11-2019

پاٹھیہ پُستک منڈل
گاندھی نگر

طباعت- 2016 طباعت نو- 2020

ناشر : گجرات راجیہ شالا پاٹھیہ پستک منڈل-'وِدیاین'، سیکٹر 10-A، گاندھی نگر کی جانب سے۔ پی۔ بھارتی (IAS)، ڈائریکٹر۔

طابع :

بنیادی فرائض

بھارت کے ہر شہری کا یہ فرض ہوگا کہ وہ *

(الف) آئین پر کاربند رہے اور اس کے نصب العین اور اداروں، قومی پرچم اور قومی ترانے کا احترام کرے ؛

(ب) ان اعلیٰ نصب العین کو عزیز رکھے اور ان کی تقلید کرے جو آزادی کی تحریک میں قوم کی رہنمائی کرتے رہے؛

(ج) بھارت کے اقتدار اعلیٰ، اتحاد اور سالمیّت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کر کے ان کا تحفظ کرے؛

(د) ملک کی حفاظت کرے اور جب ضرورت پڑے قومی خدمت انجام دے؛

(ھ) مذہبی، لسانی اور علاقائی و طبقاتی تفرقات سے قطع نظر بھارت کے عوام النّاس کے مابین یک جہتی اور عام بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دے نیز ایسی حرکات سے باز رہے جن سے خواتین کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہو؛

(و) ملک کی ملی جلی ثقافت کی قدر کرے اور اُسے برقرار رکھے؛

(ز) قدرتی ماحول کو جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی جانور شامل ہیں محفوظ رکھے اور بہتر بنائے اور جانداروں کے تئیں محبت و شفقت کا جذبہ رکھے؛

(ح) دانشورانہ رویّے سے کام لے کر انسان دوستی اور تحقیقی و اصلاحی شعور کو فروغ دے؛

(ط) قومی جائداد کا تحفظ کرے اور تشدّد سے گریز کرے؛

(ی) تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں کی بہتر کارکردگی کے لیے کوشاں رہے تاکہ قوم متواتر ترقّی و کامیابی کی منازل طے کرنے میں سرگرم عمل رہے۔

(ک) ماں باپ یا سرپرست 6 سال سے 14 سال کی عمر تک خود کے بچّے یا زیر سرپرست بچّے کو تعلیمی مواقع فراہم کریں۔

---

* بھارت کا آئین : دفعہ ۵۱ الف

فہرست

نمبر شمار	سبق	مصنف/مؤلف/شاعر	صفحہ نمبر
	Semester-I		
1	منوّر تو	طارق بن ثاقب	1
2	تکمیل	سر سید احمد خاں	3
3	غزل	ولیؔ گجراتی	6
4	لکھنو کی ثقافت	عبدالحلیم شرر	8
5	غزل	میر دردؔ	13
6	قرطبہ	محمد تقی عثمانی	15
7	غزل	مرزا غالبؔ	20
8	سفارش	احمد ندیم قاسمی	22
9	فلسفہ	محمد اقبالؔ	28
10	بھابھی جان	سہیل عظیم آبادی	30
11	گرمی اور دیہاتی بازار	جوش ملیح آبادی	38
12	اوور کوٹ	غلام عباس	40
13	آوارہ ہونا بکاوٗلی کا	پنڈت دیا شنکر نسیم	48
14	جب آنکھیں آہن پوش	عزیز احمد	51
15	گیت	میراجی	59
	Semester-II		
16	نعت	امینؔ صدیقی	61
17	گواہ	رشید احمد صدیقی	63
18	غزل	فراق گورکھ پوری	69
19	مولوی محمد حسین آزادؔ (خاکہ)	راشد الخیری	71
20	غزل	جگر مرادآبادی	77
21	ہزاروں سال لمبی رات	رتن سنگھ	79
22	غزل	محمد علوی	83
23	آوارہ گرد	قرۃ العین حیدر	85
24	غزل	حسن نعیمؔ	93
25	آخری شو (ملیالم کہانی)	پول زکریا	95
26	مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ	فیض احمد فیضؔ	98
27	مرزا غالب کی حویلی (ڈرامہ)	قاضی مشتاق احمد	100
28	موسموں کا گیت	علی سردار جعفری	109
29	اخلاق محسنہ	مولانا شبلی نعمانی	113
●	**اختیاری مطالعہ**		
1	گوکل کی شام	پنڈت ہری چند اخترؔ	117
2	جھینگر کا جنازہ	خواجہ حسن نظامی	118
3	اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک	سیّد سلیمان ندوی	121
4	اسرافیل کی موت	ن۔م۔راشد	124
5	تشنۂ فریاد	ضمیرالدین احمد	128
6	شہرآشوب	مرزا محمد رفیع سودا	146

1 مُنّور تو

طارق بِن ثاقب

پیدائش : 1958ء، وطن بہار جوگندر ضلع اودیہ

آپ کا نام محمد طارق نعمانی قطی نام طارقؔ بن ثاقب اور طارق تخلص کرتے ہیں۔ مولوی عبدالوحید ثاقب نعمانی فرزند ہیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حفظ، تجوید و قرأت اور فضیلت کی سند دارالعلوم دیوبند سے 1987ء میں حاصل کی۔ شاعری میں ڈاکٹر تابش مہدی سے شرفِ تلمّذ حاصل ہے۔ آپ اچھے شاعر کے علاوہ اچھے کاتب بھی ہیں۔ جمالیاتی خطاطی یعنی طغرہ سازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ ملک اور بیرون ملک میں بھی کافی مقبول ہیں۔

''مُنوّر تو'' حمد آپ کے حمدیہ و نعتیہ مجموعے ''وادئ نور'' سے لی گئی ہے۔ طارق نے اپنے مجموعہ میں حدود شریعت کا پاس رکھتے ہوئے حمد و نعت کے موتی اشعار کی شکل میں بکھیرے ہیں، جو ان کے قلب کی ترجمانی کرتے ہیں اور قلوب کو منور کرتے ہیں۔

زمیں کے ذرّۂ ناچیز میں منور تو
نجوم و شمس و قمر کہکشاں کے اندر تو

ترے وجود کی تشریح ماورائے شعور
ہر ایک بندش لفظ و بیاں سے باہر تو

ترے وجود کے پرتو کا ہی شناور کون؟
جو شش جہات پہ حاوی ہے وہ سمندر تو

طلب کی منزل مقصود ہے ترا ہی وجود
تصورات حقیقت کا ایک محور تو

گلوں سے پھوٹتی خوشبو حسیں دلیل تری
ہر ایک قید سے آزاد ہے معطر تو

عدم سے کرتا ہے الفاظ کا زباں پہ درود
سخنوری کا معلّم، بڑا سخن وَر تو

یوں کھول دیتا ہے انسان پر درِ ادراک
اتار دیتا ہے جیسے خرد کا لشکر تو

نگار خانۂ، ہستی کا خالق و صانع
مکین قریۂ امکاں کا ربِّ اکبر تو

خراج تیری عنایات کا میں پیش کروں؟
میں ایک بندۂ عاجز ہوں بندہ پرور تو

کہے گا پھر کبھی، طارقؔ حسین حمد تری
کرے گا جو اسے یاربّ بڑا سخن وَر تو

الفاظ و معانی

کہکشاں ستاروں کا ایک جھرمٹ **ماورائے شعور** سمجھ سے بالاتر **شناوَر** پیراک، تیرنے والا **شش جہات** چاروں طرف **درِ ادراک** عقل کی دہلیز پر **خرد** عقل **قریۂ** گاؤں

مشق

1. سوالوں کے جواب دیجیے :

(1) خدا کا نور کہاں کہاں نظر آتا ہے؟

(2) خدا کے وجود کی تشریح کیوں مشکل ہے؟

(3) شاعر نے اللہ کے کن صفات کا ذکر کیا ہے؟

2. سمجھایئے :

تیرے وجود کے پرتو کا ہے شناور کون؟
جوشش جہات پہ حاوی ہے وہ سمندر تو
یوں کھول دیتا ہے انسان پر درِ ادراک
اتار دیتا ہے جیسے خرد کا لشکر تو

3. لاحقہ ''ور'' کا استعمال کن کن لفظوں میں کیا گیا ہے۔

●

2 تکمیل

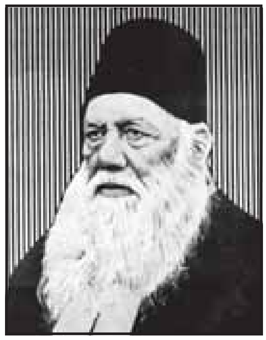

سر سید احمد خان

پیدائش : 1817ء وفات : 1898ء وطن : دہلی

ماہرتعلیم ادیب اور مصلح قوم سر سید احمد خاں مروّجہ تعلیم سے فراغت کے بعد انگریزی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں منصف مقرر ہوئے۔ 1869ء میں ولایت کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد تعلیمی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک اسکول کھولا جو پہلے کالج بنا اور 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ سر سید نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی۔ قوم کی زبوں حالی اور پستی کو دیکھتے ہوئے ان کی فلاح و بہبود کا کام کیا۔ عام لوگوں کے آداب و اخلاق کی اصلاح کی غرض سے انہوں نے اپنا مشہور رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔

سر سید کی اہم تصانیف میں "خطبات احمدیہ"، "آثارالصنادید" اور "اسباب بغاوت ہند" ان کا اسلوب سادہ، صاف اور سنجیدہ ہے۔

اس مضمون میں سر سید نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ مسلمان اخلاق اور تہذیب کے زیور سے خود کو آراستہ کریں تاکہ لوگوں کے سامنے اسلام کی اصلی صورت آ سکے۔

ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "ہر کمالے را زوالے" مگر اس کے معنی اور اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک اور بڑے حکیم نے اسی مطلب کو نہایت عمدگی اور وضاحت سے بیان کی ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ "ہم کو اپنے تئیں درجۂ کمال پر پہنچا ہوا سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے" اور بلا شبہہ ایسا ہی ہوتا ہے اس لیے کہ جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے تو اس سعی میں اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کے ایجاد سے باز رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا زوال آ جاتا ہے۔

کامل مطلق بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں ہے پس جو کچھ کہ خدا نے کیا یا کہا وہ تو اپنی قسم میں کامل ہے اور اس کے سوا اور کوئی چیز جو انسان نے کی ہو یا کہی ہو کامل نہیں ہے کیونکہ قابل سہو و خطا ہونا انسان کی شان سے ہے اگر یہ بات اس طرح پر نہ ہوتی تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہونے کی ضرورت نہ رہتی۔ پس ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں یا نتائج عقل انسانی میں ان کو کامل سمجھ لینا ہماری ٹھیٹ غلطی اور ہمارے تنزّل و ادبار کی ٹھیک نشانی ہے۔ کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے۔

جو چیز کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے ہم اس کو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں۔

ہم میں ایک استغناء پیدا ہوتا ہے جس سے سوائے اس کے اور کسی بات یا تحقیقات کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اس بات کے فائدے سے محروم رہتے ہیں۔

لوگوں کے اعتراض کے سننے کو گوارا نہیں کرتے اور اس سبب سے اپنی غلطیوں پر متنبہ نہیں ہوتے اور جہل مرکب میں پھنسے رہتے ہیں۔ کوشش سے جو ایک ترقی کا فائدہ ہے اس کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔

خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے اور جس کا یہ فائدہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں لاویں اوروں پر بھروسہ کر کر اس کو بیکار کر دیتے ہیں۔

ایسا کرنے میں ہم صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتے بلکہ آئندہ نسلوں کی عقل اور جودت طبع اور تیزی ذہن اور طاقت انتقال ذہنی اور قوت ایجاد سب مٹ جاتی ہے اور صرف اوروں کی ٹٹکاری پر ہماری چال رہ جاتی ہے اور ہم ٹھیک اس مثل کے مصداق ہو جاتے ہیں۔"چار پائے بروکتا بے چند۔"

ہم مسلمانوں نے اپنے میں اس نقص کو نہایت درجہ پر پہنچا دیا ہے اور جو نقصان دینی اور دنیوی اس سے ہم نے اٹھائے ہیں ان کی کچھ انتہا نہیں۔ بھلا دینی باتوں کو اس وقت رہنے دو اور صرف اس بات پر غور کرو کہ دنیوی علوم اور دنیوی کاروبار اور دنیا کی باہمی معاشرت اور مجالست اور رسوم و عادات اور طریقہ تعلیم اور تربیت اور ترقی علم مجلس میں کیوں ہم نہ کوشش کریں اور جس طرح اور قوموں نے ان باتوں میں ترقی کی ہے ہم بھی اسی طرح کیوں نہ ترقی کریں۔

ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے علوم اور اس کا فلسفہ اور اُس کے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے نہ سمجھیں۔ بو علی کچھ صاحب وحی نہ تھا کہ اس کے طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علوم دنیوی ہم مدّت دراز سے پڑھتے آتے تھے اور جو اپنے زمانے میں ایسے تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے انہی پر پابند رہنے کے لیے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالیٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں۔

یہ جو کچھ ہم نے کہا کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں۔ جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال پر پہنچایا ہوا اور ناقابل سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریقِ معاشرت کو کامل سمجھا اور اسی کی پیروی پر جمے رہے اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم و فنون و طریقۂ معاشرت کے ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔ اب دیکھ لو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔

ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو پچھلی لکیر کو کامل سمجھ کر اسی کو پیٹتے آتے ہیں۔ انگریز، فرینچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پہلی قومیں علم و ہنر و تربیت و شائستگی میں اپنے دور میں اپنی ہمعصر قوموں سے مقدم اور اعلیٰ تھیں اور شاید مسلمانوں کو یہ بھی عزت حاصل تھی کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے لیے استاد گنے جاتے تھے۔ مگر اُسی عیب نے جو اُن قوموں میں تھا اور اب بھی ہے اور اسی خوبی نے جو پچھلی قوموں میں تھی اور اب بھی ہے ٹھیک ٹھیک معاملہ بالعکس کر دیا ہے۔ اب یورپ کی قومیں ایشیا کی قوموں سے علم و ہنر، تربیت و شائستگی میں اعلیٰ ہیں۔ پس میرا مطلب یہی ہے کہ ہماری قوم کو بھی چاہیے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ اور لغو خیالات سے جنہوں نے ان کی عقل اور سمجھ کو خراب کر رکھا ہے اور ان کی تمام خوبیوں کو خیالاتِ فاسد کے کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ کر دیا ہے خالی کریں اور علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی میں ترقی کرنے کی کوشش کریں اور انصاف سے دیکھیں کہ ان کی تہذیب اور شائستگی میں نقصان ہونے کے سبب سے ان کی قوم کی کیسی بدنامی ہے

اور ان عمدہ اخلاق اور قواعد کو جو خدا تعالیٰ نے مذہبِ اسلام کی بدولت ان کو دیے تھے بری طرح سے استعمال میں لانے اور ان کو بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اسلام کو ہماری نالائقی کی بدولت کیسی حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں۔ کیسے خندہ زن اشارات اور کنایات اس پر کرتی ہیں اور ہماری شامتِ اعمال کو نتیجہ مذہب اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا کچھ بیجا نہیں ہے۔ اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے سو انھوں نے اس کو ایسا بدصورت بنایا ہے کہ جو کوئی نفرت کرے کچھ تعجب نہیں۔ پس اب میری یہ خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی درستی میں کوشش کر کر اور اپنے حال اور چال چلن کو درست اور عمدہ کر کر اسلام کی جو اصلی صورت ہے وہ دنیا کو دکھا دیں۔

الفاظ و معانی

ہر کمالے را زوالے ہر بڑھنے والی چیز کو زوال ہے **سہو** خطا **استغنا** بے نیازی **ادبار** زوال **مُتنبّہ** آگاہ، خبردار **جہل مرکب** جاہل ہونا اور عالم سمجھنا **جودتِ طبع** ذہانت **انتقال ذہنی** ذہن کو بدلنے کی طاقت **ٹٹکاری** زبانی جمع خرچ **چار پائے بروکتا بے چند** جانور پر کتابیں لاد دی جائیں **اخذ کرنا** نتیجہ نکالنا **لکیر پیٹنا** پرانی رسم پر چلنا **شامت اعمال** کیے کی سزا **فاسد** بگڑے ہوئے

مشق

1. **درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے :**

(1) کسی شخص یا قوم کا زوال کب شروع ہوتا ہے ؟ کیوں ؟

(2) انسان کی، کی ہوئی کوئی بات کا حل نہیں ہے اس سلسلے میں مصنف نے جو دلیلیں پیش کی ہیں انہیں لکھیے۔

(3) ارسطو اور بوعلی سینا کے سلسلے میں مصنف نے کیا کہا ہے ؟

(4) دنیا میں کتنی قسم کی قومیں ہیں ؟ ان میں کیا فرق ہے ؟

(5) غیر قومیں اسلام کے بارے میں کیا کہتی ہیں ؟ کیوں ؟

2. **ذیل کے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے :**

(الف) باز رہنا، پیروی کرنا، لتھڑ پتھڑ کرنا

(ب) سمجھایئے :

"ہر کمالے را زوالے"

(ج) ہم معنی الفاظ لکھیے :

بیجا، لغو، سعی، سہو، نظیر

•

3

غزل

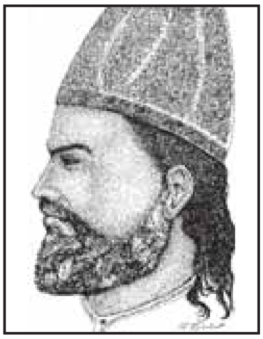

ولی گجراتی

پیدائش : 1650ء   وفات : 1707ء   وطن : گجرات

محمد ولی نام اور ولؔی تخلص کرتے تھے۔ ولی احمدآباد، گجرات میں پیدا ہوئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ ولؔی کا تعلق ایک معزز صوفی خاندان سے تھا۔ انھوں نے احمدآباد کے مشہور عالم دین حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ میں تعلیم حاصل کی اور اس زمانے کے اعتبار سے اعلیٰ تعلیم پائی۔ شاعری میں ولی نے اپنے آپ کو شاہ گلشن کا شاگرد بتایا ہے۔ ولؔی کو سیر و سیاحت کا کافی شوق تھا۔ وہ دہلی بھی گئے، دہلی میں ان کی آمد کے بعد شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

ولؔی قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے متعدد شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ انھوں نے پہلی بار فارسی غزل کے مضامین اردو غزلوں میں رائج کیے۔ ولؔی کی زبان دکنی اور آج کی اردو کے درمیان کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

سجن تجھ انتظاری میں رہی نسِ دِن کھلی انکھیاں
مثال شمع تیرے غم میں رو رو بہہ چلی انکھیاں

ہوئی جیوں جلوہ گر تجھ یاد سوں مجھ دل میں بے تابی
تپیں شعلہ نمن گرمی سوں غم کے تل ملی انکھیاں

ترے بن رات دن پھرتیاں ہوں بن بن کشن کے مانند
اپس کے مکھ اُپر رکھ کر نگہ کی بانسلی انکھیاں

تری نیناں پہ گر آہو تصدق ہو تو اچرج نئیں
کہ اس کوں دیکھ کر گلشن میں نرگس نے ملی انکھیاں

اتی خواہاں ہیں تجھ حسن و ملاحت ہور لطافت کی
کہ گویا دِل میں رکھتیاں ہیں سدا فکر ولؔی انکھیاں

الفاظ و معانی

اپس حکم، اپنا، اپنے، **سوں** سے **جلوہ گر** اپنے کو کسی خاص انداز سے دکھانے کے لیے منظر عام پر نمودار ہونا **بے تابی** بے چینی، گھبراہٹ **انکھیا** آنکھیں **بانسلی** بانسری **تصدق** صدقہ دینا، قربانی **نرگس** ایک پھول جسے شعراء آنکھ سے تشبیہہ دیتے ہیں **اچرج** اچنبھا، تعجب **اتی** بہت زیادہ **خواہاں** چاہنا

مشق

1. سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) محبوب کے انتظار میں شاعر کی کیا کیفیت ہوئی؟

(2) گلشن میں نرگس اپنی آنکھوں کو کیوں ملتی ہے؟

(3) شاعر کس چیز کا بے حد خواہاں ہیں؟

(4) تیسرے بند میں مشبّہ اور مشبّہ بہ پہچانیے؟

2. سمجھایئے :

(1) ترے بن رات دن پھرتیاں ہوں بن بن کشن کے مانند
اپس کے مکھ پر رکھ کر نگہ کی بانسلی انکھیاں

(2) تری نیناں پہ گر آہو تصدق ہو تو اچرج نئیں
کہ اس کوں دیکھ کر گلشن میں نرگس نے ملی انکھیاں

●

4 لکھنؤ کی ثقافت

عبد الحلیم شرر

پیدائش : 1860ء وفات : 1926

عبد الحلیم نام اور شرر تخلص ہے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شرر کے والد کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہاں انہوں نے عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی بھی سیکھی۔ اس کے بعد لکھنؤ واپس آئے۔ لکھنؤ سے دہلی پہنچے اور ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ دہلی سے پھر لکھنؤ آئے اور ''اودھ اخبار'' سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے ادبی مضامین اسی اخبار میں چھپتے رہے اور ان کی شاعرانہ نثر ہر طرف مقبول ہونے لگی اور اکثر لکھنے والے اس کی پیروی کرنے لگے۔

شرر کے کئی ناول ان کے اپنے رسالے ''دل گداز'' میں قسط وار شائع ہوتے رہے۔ اردو میں سب سے پہلے شرر ہی نے تاریخی ناول لکھے اور اپنے ناولوں کے ذریعے تاریخ اسلام کو زندہ کردیا۔ فردوس بریں، فلورا فلورنڈا، زوال بغداد ان کے مشہور ناول ہیں۔ اردو میں آزاد نظم آپ سے منسوب ہے۔ شرر لکھنؤ کی تہذیب کے ترجمان ہیں۔ لکھنوی تہذیب کے نمائندہ ہیں؛ لیکن اردو ادب میں ان کا شمار بحیثیت ناول نگار کیا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں کے انگریزی اور گجراتی ادب میں بھی ترجمے ہوچکے ہیں۔ مذکورہ اقتباس ان کی کتاب ''گذشتہ لکھنؤ'' سے لیا گیا ہے۔ جو لکھنوی تہذیب و ثقافت کا ترجمان ہے۔

موسیقی کے سلسلے میں سوز خوانی کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس نئے مذہبی فن کو گانے بجانے کے خلاف شرع فنون میں داخل کرنا، بے ادبی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ سوز خوانی ایک خاص قسم کی موسیقی ہی ہے۔ محرم میں شہادت سبطِ اصغر علیہ السلام کی یاد تازہ کرنا ہندوستان میں خاص شیعوں سے شروع ہوا۔ خصوصاً اس وقت سے جب کہ مذہب اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہاں کے لوگ آ آ کے ہندوستانی دربار میں رسوخ حاصل کرنے لگے۔ تاہم دہلی میں چونکہ تاجداروں اور شاہی خاندان کا مذہب سنت و جماعت تھا، اس لیے وہ خاص چیزیں جو شیعوں کی مذہبی معاشرت کے ساتھ مخصوص تھیں، وہاں نشو و نما نہ پاسکیں۔ اس لیے ان فنون کی پرورش کا گہوارہ شہر لکھنؤ اور اس کا اگلا شیعہ دربار قرار پا گیا۔

جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللّفظ خوانی کو پیدا کیا، اسی طرح موسیقی میں سوز خوانی پیدا کردی۔ پھر ان دونوں فنون کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے اور ایسے فن جو ابتداء سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تحت اللّفظ خوانی، مرثیوں کا متانت اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتا کے سنانا ہے، جس طرح شاعر مشاعرے میں اپنی غزل سناتا ہے اور سوز خوانی، ان کو پُرسوز و گداز نغمے کے ساتھ سنانا ہے۔

اصلی اور پُرانی مرثیہ خوانی، سوز خانی ہی تھی، یعنی مرثیے مجلسوں میں ہمیشہ نغمے کے ساتھ سنائے جاتے تھے، اور ان کا رواج دہلی ہی نہیں ہندوستان کے ان تمام شہروں میں تھا جن میں شیعہ حضرات آباد تھے۔ مدراس اور دکن تک میں زور و شور سے اس قسم کی مرثیہ خوانی ہوتی تھی اور ڈیڑھ دو سو برس کے تصنیف کیے ہوئے نوحے آج تک موجود ہیں۔ مرثیوں کو شاعروں کی شعر

خوانی کے لہجے میں ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے اور اس میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ وغیرہ نے جو کمالات دکھائے ان کا ذکر ہم شاعری کے سلسلے میں کرچکے ہیں۔

سوز خوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہر جگہ تھی مگر اس میں بھی لکھنؤ کے سوز خوانوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی اپنے ساتھ مخصوص کرلیا۔ سارے ہندوستان کی اگلی سوز خوانی کا اندازہ اس مثل سے ہوسکتا ہے کہ ''بگڑا گویّا، مرثیہ خواں'' لکھنؤ نے سوز خوانی کا پایہ اس قدر بلند کردیا کہ صاحبِ کمال گویّوں کا بازار بھی سوز خوانوں کے آگے سرد پڑگیا۔

لکھنؤ میں سوز خواں دیگر اہل فن کی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ یا ان کے عہد میں آئے۔ تاریخِ فیض آباد میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ کے محل میں مجلسیں ہوتیں اور جواہر علی خاں خواجہ سرا جو اُن کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا، مرثیہ خوانوں کی نوحہ خوانی سنا کرتا۔ مگر اس وقت تک یہاں کی سوز خوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن مودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنف نغمات الآصفیہ کے استاد تھے اور باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ دور دور تک کہیں ان کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سنی المذہب تھے، مگر انھوں نے موسیقی کی خاص خاص دھنیں سوزوں میں قائم کرکے اپنے شاگردوں کو بتائیں اور اس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد پڑگئی۔ اس کے بعد جب حیدری خاں کا زمانہ آیا تو ان کا معمول تھا کہ محرم میں اپنے مذاق کی مناسب دھنوں میں نوحہ خوانی کیا کرتے۔ چونکہ بہت بڑے صاحب کمال گویّے تھے اور دربار قدر دان تھا۔ اِس کوشش میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور پتہ لگ گیا کہ اگر ترقی دی جائے تو یہ فن جدا گانہ طور پر ایک خاص اور ممتاز شان پیدا کرسکتا ہے۔ موسیقی کی ہزارہا دھنوں میں سے وہ دھنیں منتخب کی گئیں جو اظہارِ حزن و ملال اور بین کے لیے مناسب ہوں اور وہ صدہا سوزوں میں قائم کی گئیں۔ آخر میں حیدری خاں نے اپنی سوز خوانی سید میر علی صاحب کو سکھادی، جو ایک شریف النسل سید زادے تھے اور انھوں نے مذہبی جوش میں اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی اور اپنے زمانے میں اتنے بڑے صاحب کمال مشہور ہوئے کہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں انھوں نے کسی بات پر برہم ہوکے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشاؔ اللہ خاں نے اپنے موثر شاعرانہ انداز اور تمسخر کی شان سے سفارش کی اور نواب نے دل دہی و قدر دانی کے ساتھ انھیں روکا۔

اس کے بعد تان سین کے خاندان کا ایک گویّا ناصر خاں لکھنؤ میں آیا اور چمکا۔ یہاں سوز خوانی کی طرف لوگوں کا توغل دیکھا تو اس نے بھی اپنے موسیقی کے کمال کو نوحہ خوانی میں صَرف کرکے مقبولیت و شہرت حاصل کی اور اپنے پڑوس کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھاکے ان کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوز خوانی کی تعلیم دی۔ ان دونوں کا کمال تمام ماسبق استادوں سے بڑھ گیا، اور سوز خوانی میں بے عدیل و نظیر ثابت ہوئے۔ انھوں نے سوز خوانی کو اعلیٰ درجے کا راگ بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ موسیقی کے اصلی راگوں کے بول تو اکثر گویّوں تک کو یاد نہیں، مگر ایسے سوز اکثر سوزخوانوں کو یاد ہیں جو راگوں کے بول ہیں، جن کو سن کے حقیقی راگ اور سچی دھنیں متمائز طور پر سمجھ لی جاسکتی ہیں۔

انھیں بزرگوں کی وجہ سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا فن گویّوں سے نکل کر شرفا میں آگیا اور کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ڈوم ڈھاڑی نہیں، شریف و وضیع ہیں، مگر سوز خوانی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ گویّوں کا بازار ان کے سامنے سرد پڑ گیا ہے۔ فی الحال منجھو صاحب اور دو ایک اور بزرگ سوز خوانی میں ایسا کمال اور ایسی شہرت رکھتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں ہر جگہ

ان کے استقبال میں شوق کی آنکھیں بچھائی جاتی ہیں اور دیگر بلاد کے لوگوں کی قدر دانی، ماہ محرم اور عزاداری کے خاص ایام میں ہمیشہ انھیں شائقین لکھنؤ کے ہاتھ سے چھین لیا کرتی ہے۔

سب سے زیادہ اثر اس مذاق نے لکھنؤ کی عورتوں پر ڈالا۔ سوزوں کی موثر اور دل کو پاش پاش کردینے والی دھنیں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے گلے سے نکلتے ہی صدہا شریف مردوں کے گلے میں اتریں اور ان کے ذریعے سے ہزارہا شریف شیعہ خاندانوں کی عورتوں کے نور کے گلوں میں اتر گئیں۔ عورتوں کو فطرتاً گانے بجانے کا زیادہ شوق ہوتا ہے اور ان کے گلے نغموں کے لیے عموماً زیادہ موزوں ہوا کرتے ہیں، یہ بااصول اور باقاعدہ نوحہ خوانی عورتوں میں پہنچی تو اس میں قیامت کی دل کشی پیدا ہوگئی اور چند روز میں شیعہ ہی نہیں ادنا طبقے کی سنّیوں کی عورتوں میں بھی نوحہ خوانی کا شوق پیدا ہوگیا اور یہ حالت ہوگئی کہ محرم میں اور اکثر مذہبی عبادتوں کے ایّام میں لکھنؤ کے گلی کوچوں میں تمام گھروں سے پُر سوز و گداز تانوں اور دل کش نغموں کی عجیب حیرت انگیز صدائیں بلند ہوتی ہیں اور کوئی مقام نہیں ہوتا جہاں یہ سماں نہ بندھا ہو۔ آپ جس گلی میں کھڑے ہوکے سُننے لگیے، ایسی دل کش آوازیں اور ایسا مست و بے خود کرنے والا نغمہ سننے میں آجائے گا کہ آپ زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ ہندوؤں اور بعض خاص سنّیوں کے مکانوں میں تو خاموشی ہوتی ہے باقی جدھر کان لگایئے نوحہ خوانی کے قیامت خیز نغموں ہی کی آوازیں آتی ہوتی ہیں۔

تعزیہ داری چونکہ نوحہ خوانی کا بہانہ ہے اس لیے سنّی اور شیعہ دونوں گرہوں کے گھروں میں نوحہ خوانی کے شوق میں تعزیہ داری ہونے لگی اور سنّی مسلمان ہی نہیں، ہزارہا ہندو بھی تعزیہ داری اختیار کرکے نوحہ خوانی کرنے لگے۔ جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ میں تعزیہ داری کے بہت زیادہ بڑھنے اور فروغ پانے کا زبردست باعث، نوحہ خوانی ہے۔

لکھنؤ میں بعض شریف، شایستہ اور تعلیم یافتہ عورتیں ایسی اچھی سوز خواں ہیں کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوز خواں ان کے مقابلے میں ہرگز فروغ نہ پاسکتے۔ اس کو بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ میں تال کٹورا کی کربلا میں گیا تھا اور وہیں ایک خیمے میں شب باش ہوا تھا۔ دو بجے رات کو یکا یک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دل کش نغمے کی آواز کان میں آئی، جس نے سب دوستوں کو جگا کے بے تاب کردیا۔ ہم سب اس آواز کے شوق میں خیمے سے نکلے اور دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے، چاندنی کھیت کیے ہوئے ہے اور اس میں عورتوں کا ایک غول تعزیہ لیے ہوئے آرہا ہے۔ سب بال کھولے اور سر برہنہ ہیں۔ بیچ میں ایک عورت ہاتھ میں شمع لیے ہوئے ہے۔ اس کی روشنی میں ایک حسین، سرو قد نازنین، چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کے نوحہ خوانی کررہی ہے اور کئی اور عورتیں اس کے ساتھ گلے بازی کررہی ہیں۔ اس سنّاٹے، اس وقت، اس چاندنی، ان کو برہنہ سر حسینوں، اور اس پُر سوز و گداز نغمے نے جو سماں پیدا کر رکھا تھا، اس کو میں بیان نہیں کرسکتا۔ نازک اداؤں کا یہ مجمع جیسے ہی کربلا کے پھاٹک میں داخل ہوا، اس سرو قامت نازنین نے پرچ کی دھن میں یہ نوحہ شروع کیا :

جب کاروان شہر مدینہ لٹا ہوا پہنچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسینؑ کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سرکھلا ہوا

اس مناسبِ حالت مرثیے نے یکا یک ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہہ ہوتا تھا کہ ان اشعار کے ذریعے سے وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے یا خود اپنے اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی۔

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی عورتوں اور ان کے ساتھ مردوں پر بھی سوز خوانی و عزاداری نے جو نمایاں اثر ڈالا ہے اور کسی چیز

نے نہیں ڈالا۔ اس کی پہلی برکت تو یہ ہے کہ تمام عورتیں بہت اچھے گلے باز ہوگئیں اور موسیقی کے سچے اصول کے ساتھ نوحہ خوانی کرنے لگیں۔ دوسری برکت یہ ہے کہ سارے اہل شہر کو، عام اس سے کہ مرد ہوں یا عورت، موسیقی کے ساتھ مناسبت ہوگئی۔ یہ جو کہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ادنا درجے کے لڑکے اور بازاری لوگ اکثر چلتے چلتے گانے لگتے اور گانے میں ایسی گلے بازی کرتے اور مشکل سے مشکل دھنوں کو اس آسانی سے اڑا لیتے ہیں کہ باہر کے لوگوں کو حیرت ہوجاتی ہے، اس کا اصلی باعث وہ نوحہ خوانی و سوز خوانی کا مذاق ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ سوز خوانی کا نشوونما باوجود عوام الناس اور ادنیٰ درجے کے جُہلا میں پھیلنے کے، صحیح اصول پر رہا اور موسیقی کے صحیح مذاق سے باہر نہیں ہونے پایا۔ بہ خلاف اور چیزوں کے، جو عوام میں پہنچتے ہی بے قاعدہ اور خراب ہوجایا کرتی ہیں۔

سوز خوانی کو گو کہ عوام شیعہ موجبِ ثواب تصور کرتے ہیں، مگر علمائے شیعہ نے اس وقت تک اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ وہ پابندی شرع میں متشدّد ہیں۔ اب تک مجتہدین اور ثقہ لوگوں کی مجلسوں میں صرف حدیث خوانی یا تحت اللّفظ خوانی ہوتی ہے اور عوام کی جن مجالس میں علمائے شریعت شریک ہوتے ہیں، ان میں بھی ان کے سامنے سوز خوانی نہیں ہوتی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سوز خوانی نے اپنی عام مقبولیت کی وجہ سے علماء کے فتوؤں پر پوری فتح پالی ہے۔مشکل یہ ہے کہ اہل سنت کے علمائے حدیث اور مشائخِ صوفیہ کے نزدیک تو غنا کے جواز کی بہت گنجائش ہے، مگر شاید فقہ اثنا عشری میں اتنی گنجائش نہیں۔ ورنہ اس فن نے اب تک سندِ جواز حاصل کرلی ہوتی۔

الفاظ و معانی

گہوارہ ہنڈولا **تحت اللّفظ** حرف بحرف **عوام الناس** عام لوگ، تمام آدمی **رسوخ** تعلق **متانت** سنجیدگی **سوز** جلن، گداز پگھلنا **نوحہ** ماتم **تمسخر** ہنسی، مذاق **توغل** ایک کام میں بہت لگے رہنا، دھن **بے عدیل و نظیر** بے مثال، **جواز** اجازت، جائزہ ہونا **جہلا** جاہل کی جمع **عزاداری** سوگ، ماتم **بلاد** شہر **شب باشی** رات کا قیام **ثقہ** معتبر **مشدد** کسی چیز پر سختی سے پابند رہنا

1. سوالات کے جوابات ایک جملے میں لکھیے :

(1) ہندوستان میں سوز خوانی کی ابتداء کب ہوئی؟

(2) کن کی شہادت کی یاد تازہ کرنے کے لیے سوز خوانی کی شروعات ہوئی؟

(3) دہلی میں سوز خوانی کی نشو و نما کیوں نہ ہوسکی؟

(4) سوز خوانی کا فنون کس شہر میں پروان چڑھا؟

(5) مرثیے مجلسوں میں کس طرح سنائے جاتے تھے؟

(6) لکھنؤ میں سوز خواں کی شروعات کس کے عہد میں ہوئی؟

(7) حیدری خان کے زمانے میں کس نے سوز خوانی کے فن کو ترقی دی؟

(8) مشہور مرثیہ گو شاعر کا نام لکھیے۔

(9) میر علی حسن اور بندہ حسن نے سوز خوانی کے فن کو اعلیٰ درجہ کا فن کس طرح بنایا؟

(10) ہندوستان میں کس سوز خوان کے لیے استقبال میں آنکھیں بچھائی جاتی تھیں؟

.2 **تفصیل سے جواب لکھیے :**

(1) سوز خوانی کا لکھنؤ کی عورتوں پر اثر بیان کیجیے۔

(2) لکھنؤ میں پردے کی روک نہ ہوتی تو عورتیں مرد سوز خواں فروغ نہ پاسکتے۔ سمجھائیے۔

(3) سوز خوانی کن مجلسوں میں رائج نہیں ہے؟

.3 **جملوں کی ترتیب کیجیے :**

(1) اگرچہ سوز خوانی سے تھی پہلے۔

(2) دوستوں کو جس نے بے تاب جگا کر کر دیا۔

(3) ایک غول تعزیہ لیے ہوئے عورتوں کا آرہا ہے۔

.4 **حرفِ عطف :** دو اسموں، فعلوں یا جملوں کو آپس میں جوڑنے والے الفاظ کو حرف عطف کہتے ہیں۔ جیسے اور، و، پھر، بلکہ، یا، نہ وغیرہ۔ کبھی کبھی دو جملوں کے درمیان حرف عطف مخدوف ہوتا ہے۔

(1) آپ جس گلی میں کھڑے ہو کے سننے لگیے۔

(2) دور دور تک ان کا جواب نہ تھا۔

(3) مکانوں میں تو خامشی ہوتی ہے۔

(4) نہ نہ ایسا مت کرو۔

.5 **محاورہ کو معنی بتا کر جملے بنائیے :**

پاش پاش کرنا، سرد پڑنا، برہم ہونا، آنکھیں بچھانا

.6 **مرکب الفاظ کی ترکیب بتائیے :**

قدر دانی نوحہ خوانی

دل کش حیرت انگیز سوز خواں

.7 **مترادف الفاظ کو ترتیب سے لکھیے :**

شہرت، نغمہ، فروغ، مقبولیت، صدا، شک، تالیف، آواز، شبہہ، سرور، ترقی، تصنیف

●

5	# غزل

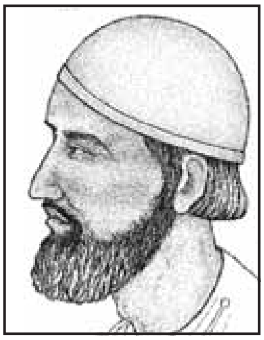

میر دردؔ

پیدائش 1721ء وفات 1785ء

خواجہ میر نام اور دردؔ تخلص کرتے تھے۔ اُن کے والد خواجہ محمد ناصر فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ دردؔ کو شاعری اور تصوف ورثے میں ملا تھا۔ شعر گوئی کا آغاز فارسی سے ہوا تھا۔ بعد میں اردو کی طرف توجہ کی۔ تصنیف و تالیف کا شوق اوائل عمر ہی سے تھا۔ ان کی تصانیف میں احکام الصلوٰۃ، واردات، علم الکتاب، دردِ دل، شمعِ محفل، آہِ سرد اور نالۂ درد مقبولِ عام ہیں۔

دردؔ کی غزلیں مختصر اور منتخب ہوتی تھیں۔ خیالات میں سنجیدگی اور متانت تھی۔ ساتھ ہی درد اور کسک، سوز و گداز کی شاعری کا وصف تھا۔ ان پر جو گذری تھی اس کو نہایت سلیقے سے شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ مسائل تصوف کو انھوں نے سمجھ کر برت کر اور ان مدارج سے گذر کر سلیس اور رواں زبان میں بیان کیا ہے۔

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال، تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر ازفنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لاسکے

غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار، آپ سے باہر نہ جاسکے

گر بحث کرکے بات بٹھائی، پہ کیا حصول
دل سے اٹھا خلاف، اگر تو اٹھا سکے

اطفائے نارِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بیخود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بخود پھر نہ لاسکے

الفاظ و معانی

وسعت گنجائش، پھیلاؤ **فتادہ** زمین پر پڑا ہوا، گرا ہوا **زینہار** ہرگز **حصول** حاصل، فائدہ **اِطفا** آگ بجھانا

1. سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) شاعر نے دل کی عظمت کو کس طرح بیان کیا ہے؟

(2) شاعر قاصد کو جانے کو کیوں کہتا ہے؟

(3) شاعر نے غافل کسے کہا ہے؟ کیوں ؟

(4) شاعر نے ادراک و فہم کو طلسم کیوں کہا ہے؟

2. تشریح کیجیے :

(1) وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

(2) اطفائے نارِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

●

6	# قُرطبہ

محمد تقی عثمانی

پیدائش : 1943ء وطن دیوبند(یوپی)

محمد تقی عثمانی 5/ اکتوبر 1943ء میں ضلع سہارنپور کے قصبے دیوبند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم اپنے وقت کے ممتاز عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ تقی صاحب نے 1958ء پنجاب بورڈ سے فاضل عربی کا امتحان پاس کیا۔ 1952ء میں دارالعلوم کراچی سے عالم کا امتحان پاس کیا۔ دارالعلوم کراچی ہی سے 1961ء میں تخصص فی الضمہ (phd) حاصل کی 1964ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کیا اور 1967ء میں عربی ادب میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تقی صاحب مفتی، عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی اور غیر ملکی اسلامی تہذیبی اور سرکاری اداروں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

''جہاں دیدہ'' مولانا کا عظیم کارنامہ ہے جس میں عالم اسلامی کے جو سفر کیے ہیں۔ اس کی تفصیلات ہے۔ مولانا ادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ عدل گستر منصف بھی رہے ہیں۔ اس لیے آپ کو مسلمانوں کے مذہبی علمی اور ادبی تعلیمات کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی اور آپ جن جن ممالک میں گئے خاص طور پر ان ملکوں کی ثقافت، تہذیب اورعلم و ادب سے خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

قرطبہ اندلس کا ایک علمی ادبی اور ثقافتی مرکز تھا۔ ہمارے اسلام مراکز میں مسجد قرطبہ مشہور ہے۔ مولانا نے قرطبہ کے تعلق سے ایک شاندار منظر نامہ پیش کیا ہے۔

قرطبہ اندلس کے قدیم شہروں میں سے ہے، دوسری صدی قبل مسیح علیہ السلام کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ایک رستے بستے شہر کی حیثیت سے ملتا ہے، اور اس وقت اسے ''کوردوبا'' (Cordoba) کہا جاتا تھا۔ جب پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو یہاں قوطیوں کی حکومت تھی۔ طارق بن زیاد نے 92ھ (721ء) میں اسے فتح کیا۔ مسلمان فوجوں نے اہل شہر کے ساتھ بڑی فراخدلی اور رعایت کا معاملہ کیا۔ مسلمانوں نے اندلس فتح کرنے کے بعد شروع میں اشبیلیہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، لیکن سلیمان بن عبدالملک کے دور میں والئ اندلس سمح بن مالک خولانی نے دارالحکومت اشبیلیہ سے قرطبہ منتقل کرلیا اور اس کے بعد یہ صدیوں تک اندلس کا دارالخلافہ بنا رہا۔ 138ھ میں جب عبد الرحمٰن الداخل نے یہاں اموی سلطنت قائم کی تو اس کے بعد سے اہل شہر کو زبردست ترقی ہوئی۔

اموی خاندان نے قرطبہ پر تین صدی سے زائد حکومت کی، اس کے بعد یکے بعد دیگرے یہاں بنی حمود، بنی جہور، بنی عباد، مرابطین اور موحدین کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، یہاں تک کہ 634ھ میں قسطلہ کا عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ اس پر قابض ہوگیا۔ اس طرح اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت 534 سال قائم رہی۔

مسلمانوں کے دور میں قرطبہ دنیا کے متمدن ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ شہراکیس بڑے بڑے محلوں پر مشتمل تھا۔ خلیفہ ہشام المؤید کے زمانے (366ھ) (399ھ) (میں شہر کا سروے کیا گیا تو شہر کے مکانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ دکانوں کی تعداد اسی ہزار چار سو شمار کی گئی۔ عبدالرحمٰن الداخل کے زمانے (138ھ) (172ھ) (میں شہر کی مسجدوں کی تعداد چار

سو نوے تھی اور بعد میں سولہ سو مساجد تک کا ذکر تواریخ میں ملتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو عظیم الشان عمارتیں شاندار سڑکیں، زبردست پل، اپنے دور کے لحاظ سے زبردست کارخانے اور جدید تمدنی سہولیات قرطبہ کو دیں۔ ان کا تذکرہ کرنے کے لیے مورخین اور ادیبوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں اور اندلس کے مشہور مورخ مقری نے ''نفح الطیب'' کی ایک پوری جلد قرطبہ ہی کے تذکرے کے لیے وقف کی ہے۔

علم وفضل کے لحاظ سے بھی ''قرطبہ'' اندلس کا عظیم ترین شہر سمجھا جاتا تھا، اندلس سے علم و دانش کے ہر میدان میں جو قدآور عالمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان میں سے بیشتر قرطبہ ہی سے تعلق رکھتی تھیں۔ مشہور مفسر اور صحیح مسلمؒ کے شارع علا قرطبہ، فقہ اور فلسفہ کے امام علامہ ابن رشد، مسلک اہل ظاہر کے سرخیل علامہ ابن حزم، طب اور سرجری کے مسلم الثبوت سائنس دان ابوالقاسم زہراوی، سب اسی شہر میں دادعلم وفضل دیتے رہے۔

قرطبہ کے کتب خانے دنیا بھر میں ضرب المثل تھے۔ علم و ادب کے ذوق اور اس کے ہمہ گیر چرچے کا عالم یہ تھا کہ کوئی گھر ایک اچھے کتب خانے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ معاشرے میں سب سے بڑی قابل ذکر بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ فلاں شخص کے پاس فلاں کتاب کا ایک ایسا نادرنسخہ ہے جو کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ جو لوگ طبعی طور پر کتابوں کا ذوق نہ رکھتے ہوں، انہیں معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، چنانچہ بہت سے لوگ محض فیشن کے طور پر اپنے گھروں پر کتابوں کی الماریاں رکھتے، اور انہیں مختلف علوم وفنون کی کتابوں سے سجاتے تھے۔

اس سلسلے میں مقریؒ نے ایک حضرمی شخص کا ایک دلچسپ واقعہ اسی کے الفاظ میں نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک نادر کتاب کی ضرورت تھی، میں اس کی تلاش میں قرطبہ آیا، اور کتابوں کے سارے بازار چھان لیے۔ بالآخر ایک جگہ کتابوں کا نیلام ہورہا تھا، وہاں مجھے وہ کتاب مل گئی، جس کی مجھے ضرورت تھی، میں اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا، اور اسے حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ بولی لگانی شروع کردی۔ لیکن جونہی میں کوئی بولی لگاتا، ایک دوسرا شخص اس سے آگے بڑھ کر بولی لگا دیتا۔ ہوتے ہوتے اس شخص نے اتنی قیمت کی بولی لگا دی کہ وہ حد سے زیادہ تھی۔ میں نے نیلام کرنے والے سے کہا کہ ذرا مجھے اس شخص سے ملاؤ جو یہ حد سے زیادہ بولی لگا رہا ہے۔ اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیاجو اپنے لباس سے کوئی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے جاکر کہا ''آپ کوئی بڑے فقیہ معلوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی عزت میں اضافہ کرے، اگر واقعتاً آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہے تو میں آپ کے حق میں دستبردار ہوجاتا ہوں۔''

اس شخص نے جواب دیا ''میں کوئی فقیہ نہیں ہوں، بلکہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے؟ لیکن میں نے بڑی محنت سے اپنے گھر میں ایک کتب خانہ بنایا ہے جو شہر کے شرفاء میں کوئی مقام پاسکے۔ ایک الماری میں تھوڑی سے جگہ خالی ہے جس میں یہ کتاب سما سکتی ہے۔ اس کتاب کی جلد بھی بہت خوبصورت ہے، اورتحریر بھی بہت حسین ہے، اس لیے میں اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے یہ کتاب خریدنا چاہتا ہوں۔'' اس پر میں نے اس سے کہا کہ ''بادام اس شخص کو مل رہا ہے جس کے منہ میں دانت نہیں۔''

ایک مرتبہ قرطبہ کے مشہور علامہ ابن رشدؒ اور اشبیلیہ کے رئیس ابوبکر زہر کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ قرطبہ بہتر ہے یا

اشبیلیہ۔ ابوبکر بن زہر نے اشبیلیہ کی بہت سی خوبیاں کیں تو علامہ ابن رشدؒ نے جواب دیا:

''آپ جو خوبیاں بتا رہے ہیں، ان کا تو مجھے علم نہیں، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جب اشبیلیہ میں کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا کتب خانہ بکنے کے لیے قرطبہ آتا ہے، اور جب قرطبہ میں کسی گویے کا انتقال ہوتا ہے تو ساز و سامان بکنے کے لیے اشبیلیہ جاتا ہے۔''

جس شہر میں کتابوں اور کتب خانوں کے ساتھ عوام کی محبت کا یہ عالم ہو، اس کی علمی اور ادبی فضا کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرطبہ کی خواتین اور بچے تک اس علمی ذوق سے جس طرح سرشار تھے، اس کا حال مورخین نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

شہر بھر پر چھائے ہوئے اس علمی ذوق کا نتیجہ یہ تھا کہ قرطبہ کے لوگ اپنی شرافت و نجابت اپنی خوش اخلاقی، خوش وضعی اور سنجیدگی میں نہایت ممتاز سمجھے جاتے تھے، اور سامان عیش کی فراوانی، مناظر قدرت کے حسن، آب و ہوا کی نشاط انگیزی اور تفریح گاہوں کی کثرت کے باوجود وہ اوچھی حرکتوں، اور خلاف تہذیب منکرات سے کوسوں دور تھے۔ اندلس کے ایک باشندے اہل قرطبہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہترین اور صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں، دینی احکام کی پوری پابندی کرتے ہیں، نمازیں پابندی سے پڑھتے ہیں، تمام اہل قرطبہ شہر کی جامع مسجد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، اگر کسی بھی شخص کو کہیں کوئی شراب کا کوئی برتن نظر آجائے تو وہ اسے بلا تکلّف توڑ ڈالتا ہے، وہ ہر طرح کے منکرات سے نفرت کرتے ہیں، اور ان کا سرمایہ فخر و ناز تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک خاندانی شرافت، دوسرے سپہ گری اور تیسرے علم۔''

جس قرطبہ کے حالات کتابوں میں پڑھے تھے اور جس کی حسین فضا میں لکھی ہوئی کتابیں آج بھی مجھ جیسے طالبِ علم کے لیے رہنمائی کا عظیم ذخیرہ ہیں، آج وہی قرطبہ نگاہوں کے سامنے تھا، لیکن دنیا بدلی ہوئی تھی، نہ وہ دین و ایمان، نہ وہ علم و فضل، نہ وہ مسجدیں اور درسگاہیں، نہ کتب خانے اور کتابیں، نہ وہ شرافت و متانت، نہ وہ عالی دماغ انسان جنھوں نے اس خطے کو دنیا بھر میں سرفرازی عطا کی تھی، اب تو میرے سامنے بیسویں صدی کے یورپ کا ایک شہر تھا جس کی وسیع سڑکوں پر مادہ پرستی کی دوڑ ہورہی تھی، جس کی دو رویہ عمارتوں میں کفر و شرک کا بسیرا تھا اور جس کے بسنے والا انسان شرافت و متانت کو بزور شمشیر زیر کرکے سات سو برس کا سفر طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں نفس پرستی شرافت کا منہ چڑا کر اسے عہد رفتہ کی جہالت سے تعبیر کرتی ہے۔

قرطبہ کی ابتدائی آبادی سے گزر کر ہم کچھ اور آگے چلے تو سامنے ایک دریا اور اس پر بنا ہوا پل نظر آیا۔ یہ قرطبہ کا مشہور دریا ''وادی الکبیر'' تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوسیدہ فصیل نظر آرہی تھی جو یقیناً کبھی قرطبہ کی شہر پناہ وہی ہوگی۔ پل عبور کرنے کے بعد ہم باقاعدہ شہر میں داخل ہوگئے۔ ہم نے غرناطہ سے روانہ ہوتے وقت ہوٹلز کے استقبالیہ سے قرطبہ کے ایک گیٹ پر پہنچ گئے، جس کا نام ہوٹل میل تھا۔ یہ قرطبہ کا مشہور ترین ہوٹل تھا اور جب ہم اس کمرے میں پہنچے جس میں ہمیں ٹھہرنا تھا تو اندازہ ہوا کہ اس کا معیار غرناطہ کے ہوٹلز سے کافی بہتر تھا۔

جب ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو تقریباً پونے دو بجے کا عمل ہوگا۔ ہوٹل کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ جامع قرطبہ چار بجے سیاحوں کے لیے کھلتی ہے، چنانچہ ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ ریستوران میں کھانا کھایا، مغربی ملکوں میں جہاں حلال گوشت میسر نہ ہو، وہاں ابلی ہوئی مچھلی سب سے بہتر غذا ہوتی ہے، چنانچہ وادی الکبیر کی صاف ستھری اور تازہ مچھلی نے کام و دہن کی خوب خوب تواضع کی۔

کھانے کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی، اور جامع قرطبہ روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی پیچ در پیچ سڑکوں اور محلوں سے ہوتی ہوئی ایک طویل و عریض قلع نما عمارت کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہی مسجد قرطبہ ہے۔ ہمارے سامنے مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ایک پر شکوہ، بلند و بالا اور طویل عمارت تھی جس کی دیوار کو زمین پر بنے ہوئے بڑے بڑے پشتوں نے سہارا دیا ہوا تھا۔

الفاظ و معانی

مشتمل شامل ہونے والا، شامل، شریک **مُتَمَدِّن** بسنے والا، مہذب **متجاوز** اپنی حد سے بڑھنے والا **نسخہ** ترکیب، طریقہ، لکھا ہوا **فقیہ** علم فقہ کا عالم، شرعی مسئلوں سے واقف، مفتیٔ دین **نجابت** شرافت **فراوانی** زیادتی، کثرت **منکرات** بُرائیاں **فصیل** دیوار، چہار دیواری **عریض** چوڑا، لمبا، عرض دار **منہدم** گرا ہوا

مشق

1. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب ایک جملے میں لکھیے :

(1) مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تب وہاں کس کی حکومت تھی؟

(2) مسلمان فوج نے اہل شہر کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا؟

(3) دارالحکومت اشبیلیہ کو ''قرطبہ'' میں کس نے منتقل کیا؟

(4) کس کی حکومت کے دوران قرطبہ کو ترقی حاصل ہوئی؟

(5) علم وفضل کے لحاظ سے قرطبہ کی اندلس کا عظیم ترین شہر کیوں سمجھا جاتا تھا؟

(6) قرطبہ کے مشہور دریا کا نام بتائیے۔

2. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب دو۔ تین جملوں میں لکھیے :

(1) مسلمانوں کے عہد عروج میں قرطبہ کو کون سی سہولیات عطا ہوئیں؟

(2) قرطبہ کی اشبیلیہ سے بہتر بتانے کے لیے علامہ ابن رشد نے کیا جواب دیا؟

(3) ''اب تو میرے سامنے بیسویں صدی کے یورپ کا ایک شہر تھا۔'' مصنف کے اس قول کی وضاحت کیجیے۔

(4) اس سبق میں دو ہوٹلوں کا ذکر آیا اس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

(5) مسجد قرطبہ کے بارے میں مختصر میں لکھیے۔

3. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے لکھیے :

(1) اس سبق سے وہ واقعہ لکھیے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرطبہ کے بہت سے لوگ فیشن کے طور پر اپنی الماریاں علوم وفنون کی کتابوں سے سجاتے تھے؟

(2) ''قرطبہ کے کتب خانے دنیا بھر میں ضرب المثل تھے۔'' اس قول کی روشنی میں لوگوں کے علم و ادب کے ذوق کو سمجھایئے۔

(الف) جمع کا واحد لکھیے۔

مساجد۔ تواریخ۔ مؤرخین۔ خواتین۔ احکام۔ کتب۔ شرائط، شرفاء

(الف) اگر واقعتاً آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہے تو میں آپ کے حق میں دستبردار ہوجاتا ہوں۔

جملے میں خط کشیدہ الفاظ : 'اگر' حرفِ شرط ہے اور شرط کے جواب میں جو کچھ آتا ہے اسے جزا کہتے ہیں۔ 'تو' حرفِ جزا ہے۔

مندرجہ بالاقسم کے جملے تلاش کرکے اپنی کاپی میں لکھیے۔

(ب) 'کسی تاریخی مقام کی سیر' اس عنوان پر مضمون لکھیے۔

●

غزل

7

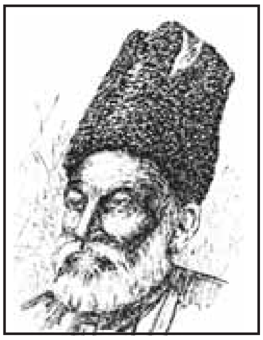

غالبؔ

پیدائش : 1797ء وفات : 1869ء وطن : آگرہ

اسد اللہ خاں نام اور غالبؔ تخلص کرتے تھے۔ دادا مغل عہد کے آخری زمانے میں ایران سے ہندوستان آئے۔ غالبؔ آگرہ میں پیدا ہوئے وہ گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی دِلّی کے ایک معزز نوابی خاندان میں ہوگئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد وہ آگرہ سے دلی آگئے۔ اور آخری دم تک یہیں رہے۔ بسر اوقات کے لیے کچھ خاندانی جائداد تھی۔ غالب بڑے شگفتہ مزاج تھے ان کی طبیعت میں شوخی و ظرافت بہت تھی۔

غالب کو ہمارے مبصرین نے اردو شاعری کا مسلم الثبوت استاد تسلیم کیا ہے۔ ادب اور خاص طور پر غزل میں انہوں نے اپنی جدت طبع سے نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ غزل کو فکری اور نفسیاتی گہرائی عطا کی اور ساتھ ساتھ تخیل کی بلندی اور طرز ادا کی شوخی بخشی ہے۔ انداز بیاں کی تہہ داری اور زندگی سے بے پناہ محبت ہی میں ان کی مقبولیت کا راز پنہاں ہے۔

اردو ادب میں غالبؔ ہی وہ ہستی ہیں جن کو نظم و نثر دونوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل ہے۔ ان کے خطوط اردو نثر کے اعلیٰ شاہکاروں کی فہرست میں نمایاں مقام پر ہیں۔

درد، منّت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟ — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی! — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گردب گیا، لہو نہ تھا — کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟ — لے کے دل، دل ستاں روا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

الفاظ و معانی

درد منّت کش دوا نہ ہوا دکھ نے دوا کا احسان نہیں لیا

مشق

1. سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) درد کی دوا نہ ہونے پر شاعر کیوں خوش ہوئے؟

(2) رقیبوں کو جمع کرنے کو شاعر نے تماشہ کیوں کہا ہے؟

(3) بندگی میں بھلا نہ ہونے کو شاعر نے نمرود کی خدائی کیوں کہا ہے؟

(4) ''جان دے کر بھی شاعر حق ادا نہیں کرسکا'' وضاحت کریں؟

2. تشریح کیجیے :

(1) درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

(2) رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دل ستاں نہ ہوا

3. اس غزل میں سے تجنیس تام کا شعر تلاش کر کے لکھیے۔

•

8 سفارش

احمد ندیم قاسمی

پیدائش : 1916ء وفات : 2006

احمد شاہ قاسمی نام تھا اور ندیم آپ کا تخلص ہے۔ سرگودھا (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ غربت اور تنگ دستی کے ماحول میں پرورش پائی۔ جوں توں کرکے تعلیم حاصل کی۔ کئی چھوٹی چھوٹی نوکریاں کیں۔ آخر کار ملتان کے محکمۂ آبکاری میں ملازم ہوگئے؛ لیکن چونکہ نو عمری سے ہی طبیعت شعر و ادب کی طرف مائل تھی اس لیے زیادہ عرصے تک ملازمت نہ کرسکے اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔

احمد ندیم قاسمی نے افسانے کے علاوہ شاعری، تنقیدی، مضامین، بچوں کا ادب، اخبارات کے کالم، مزاحیہ خاکے اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کے لیے فیچر بھی لکھّے ہیں۔ مختلف ادبی رسائل کے مدیر بھی رہے جن میں ''ادب لطیف'' ''امروز'' اور سہ ماہی رسالہ ''فنون'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

افسانہ نگاری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ شگفتہ انداز بیان اور انسان دوستی ان کے افسانوں کی خاص خوبی ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

موجودہ دور میں ہر فرد کی حیثیت کا اندازہ اس کے حلیے سے لگایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ویسا ہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ کئی مرتبہ انسان کسی کی مدد بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن حالات اور مصروفیت کی وجہ سے نہیں کر پاتے، پھر بھی ہم یہ اقرار نہیں کرتے ہیں کہ یہ کام ہم نے نہیں کیا۔ پورا معاشرہ اسی کمزوری کا شکار ہے۔ کہانی ''سفارش'' ہم سب کی اسی کمزوری کی عکاس ہے۔

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا۔ ''بھئی فیکے ''تانگا کہاں ہے؟ تانگا لاؤنا۔''

''تانگا تو بابو جی، آج نہیں جوڑا ہے۔'' فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا، آج اتنا معصوم لگ رہا تھا جیسے پہلے جماعت میں داخلہ لینے آیا ہے۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے فیکے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بابوجی ایک کام ہے۔''

''ہاں ہاں کہو۔'' میں نے کہا:

''کام یہ ہے بابوجی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟'' فیکا بولا۔ ''اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔''

''اوہو'' مجھے دکھ ہوا۔ کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟''

''جی نہیں۔'' فیکے کے چہرے پر بھولپن کا ایک چھینٹا پڑ گیا۔

''لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو سانڈے کا تیل بیچنے والا ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے۔ امّاں نے بھی یہی صلاح دی۔ اس نے ''لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ'' پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیرلی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی قسم کھا کر کہتا ہوں، جب سے اب تک آنکھ لگی ہو تو اپنے باپ کا نہیں۔ بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں؟''

اس وقت فیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے، میں نے کہا ''تم بھی حد کرتے ہو فیکے اب آگے بھی کہو نا۔''

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی۔ وہ بولا۔ ''بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے رات تو چیخ چاخ کے گزار دی پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چچا رشید نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ ابال کر باندھو باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی بابو جی۔ اسے ایک اسپتال میں لے گئے۔ پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہ تھی۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو اسپتال میں چوکیدار ہے۔ اس کی سفارش سے جگہ مل گئی پر برانڈے میں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھئے ہاتھ باندھتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہہ دیجیے کہ صدیقے مریض کو ذرا سا دیکھ لے۔''

میں نے کہا۔ ''وہاں ایک ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر عبدالجبار، ان سے میرا سلام کہو۔ کام ہوجائے گا۔ نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے۔ نام یاد کرلو ڈاکٹر عبدالجبار۔

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کرکے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی تانگا مل گیا۔ تانگا میو اسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا اسپتال کے ایک چوکیدار سے باتیں کررہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر عبدالجبار کا پتہ پوچھ رہا ہوگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ اسپتال جاکر جبار صاحب سے کہہ دوں مگر اب تانگا آگے نکل گیا تھا۔ اور مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی تھی۔

کچھ دور جاکر گھوڑا پھسل کر گرا۔ اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکایک جبار صاحب کا اسکوٹر میرے تانگے کے قریب سے زن سے گزر گیا۔ ''جبار صاحب!'' میں چلّایا۔ مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں، میں نے سوچا کل کہہ دوں گا۔ کل پہلا کام یہی کروں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ بابو جی آئیں تو مجھے بلالیں۔

میں نے سوچا اس وقت کون بلائے، اگر جبار صاحب اسپتال ہی کو جارہے تھے اور فیکے کا کام ہوگیا ہے تو شکریہ صبح قبول کرلوں گا اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہوگی صبح ہی کو ہوگی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

''یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے میں ہی پڑا رہا؟'' میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

''جی ہاں۔'' وہ بولا۔ ''مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابوجی۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا۔ دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں۔''

''اور اس کی آنکھ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چلی گئی بابوجی۔'' فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو اسپتالوں میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہوگا روپیہ بھی ضائع ہوگا۔''

فیکا بولا۔ (''بابوجی کیا پتہ آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولہا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتہ کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔'')

میں اس بات سے چونکا آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا۔ ''بابوجی، ذرا سا میرے ساتھ چلے چلیے۔''

میرے جسم میں سے نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا۔ شیو کرنا تھا۔ چائے پینی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا کارڈ دیئے دیتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر جبار کو دکھادو۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کردیں۔ تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا۔

وہ مجھے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہے۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ جبار صاحب! اس کا کام کردیجیے بے چارا غریب آدمی دعائیں دے گا اور مجھے یقین تھا کہ کام ہوجائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام کو اس نے مجھے بتایا کہ ''جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ۔ اور میری باری آتی ہی نہیں گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابوجی۔''

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہوگئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخو پورہ جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا، مگر فیکا نہ آیا چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آ نکلا مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔ ''کیوں فیکے، جبار صاحب نے کام کر دیا نا؟''

میں نے فوراً کہا۔ ''میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔''

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اٹھی۔ جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے، کہ دیکھو بڈھے کو تکلیف نہ ہو۔''

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے، مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دور کر دی۔ مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا۔ ''آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب انہوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے اسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابوجی۔ آج میں امام کو ساتھ لے کر گیا۔ دو روپے گُل ہوگئے کچھ ہوسکے تو کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں۔''

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہوگئی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں چرا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''بابوجی سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔''

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ ''واپس آ گیا نا تمہارا بابا؟''

فیکا بولا۔ ''واپس بھی آ گیا اور اپریشن بھی ہوگیا جمعہ کو پٹی کھل رہی ہے دعا کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''اللہ رحم کرے گا۔''

پھر وہ جمعہ کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ بابوجی غضب ہوگیا پٹی کھلی تو پتہ چلا کہ ایک آنکھ تو گئی تھی دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم ملے تو دوسرا اپریشن ہوگا اور دوسری آنکھ کا بھی ہوگا۔''

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اسے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ اسپتال میں نہ ہوئے تو انہیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔ ادھر فیکا بھی غائب ہوگیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی نوکر نے آ کر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے بتا دیا کہ میں موجود ہوں؟''

''جی ہاں۔'' نوکر بولا۔ ''بس میرے منہ سے نکل گیا۔''

''بڑے احمق آدمی ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ ''جاؤ کہہ دو کپڑے بدل رہے ہیں آتے ہیں۔''

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا دو چلو دو لاکھ کی بھی بات نہیں۔ دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جارہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کرلینا چاہیے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے سچی بات بھی معلوم ہوجائے اور اسے دکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا۔'' بابو جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ سمجھ نہیں آتا......'' اس کی آواز بھر آگئی۔

میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ بمشکل میں نے کہا۔'' فیکے۔ بات یہ ہے فیکے کہ ...... بات یہ ہے......'

آنسوؤں سے بھیگا ہوا بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لیے فیکا اٹھا اور بولا ''بابو جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں۔ میرا بابا ٹھیک ہوگیا ہے اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہوگئی ہیں۔ اسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی قسم خدا کی عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔''

اور میں نے ایک بہت لمبی گہری سانس لے کر کہاں۔''کوئی بات نہیں فیکے۔ کوئی بات نہیں۔''

الفاظ و معانی

کوچوان گاڑی چلانے والا **رمق** ذرا سا **ممنونیت** احسان مندی **ندامت** شرمندگی **اعتراف کرنا** اقرار کرنا **گتھم گتھا** لڑائی جھگڑا **شکست** ہار **تشویش** پریشانی **احمق** بے وقوف **صدر** بڑا

مشق

1. دو-تین جملے کے جواب لکھیے :

(1) فیکا کوچوان کیوں پریشان حال تھا؟

(2) کس کی سفارش سے اسپتال میں جگہ ملی تھی؟

(3) بابو جی نے کس ڈاکٹر سے رابطہ کرنے کے لیے کہا؟

(4) فیکا بابو جی سے کس کام کی سفارش کروانے کے لیے آیا تھا؟

(5) فیکا کوچوان کس بات کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا؟

(6) آنکھوں کی درستی کے لیے لوگوں نے کون سے سُرمے دیے؟

(7) بابو جی نے کارڈ پر کیا لکھا تھا؟

.2 **تفصیلی جواب لکھیے :**

(1) آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ سمجھاؤ۔

(2) بابو جی کو ندامت نے کیوں گھیر لیا تھا؟

(3) فیکا کوچوان کے بابو جی کا شکریہ کس انداز میں کیا؟

.3 **جملہ کون کس سے کہتا ہے۔ لکھیے :**

(1) آپ میرے بابا کو جانتے ہیں نا؟

(2) میں نے انہیں فون کر دیا تھا؟

(3) بڑے احمق آدمی ہو۔

(4) حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کے کہا ہے۔

(5) پوست کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ

.4 **حرف عطف کی پہچان کیجیے :**

(1) کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے۔

(2) دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

(3) آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا۔

(4) میں نے وعدہ کیا کہ کل میں ضرور چلوں گا۔

.5 **جملوں میں سے مرکب اور پیچیدہ جملے الگ کیجیے :**

(1) محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

(2) مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا۔

(3) میرے جسم میں سے نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔

(4) اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا تھا۔

.6 **رموز اوقاف پہچانیے :**

''کیا بات ہے فیکے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔''بابو جی ایک کام ہے۔''

''ہاں ہاں کہو۔'' میں نے کہا:

''کام یہ ہے کہ بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا۔'' ''فیکا بولا۔ اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔''

کہاوت سمجھائیے : نیم حکیم خطرۂ جان

محاورہ کا معنی بتا کر جملے میں استعمال کیجیے :

سرخ ہونا، زار زار رونا، تیور بدلنا، اعتراف کرنا

●

9	# فلسفہ

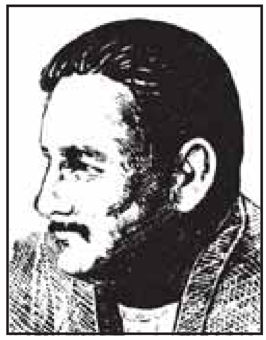

ڈاکٹر اقبالؔ

پیدائش : 1878ء وفات 1938ء وطن : سیالکوٹ

نام محمد اقبال اور اقبالؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا ایک معزز خاندان تھا۔ ان کے اجداد دینی علوم سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اقبال نے اپنی ابتدائی تعلیم میر حسن صاحب سیالکوٹی سے حاصل کی۔ انھیں کی صُحبت میں شاعری اور ادبیات کا ذوق ابھرا۔ شاعری زمانۂ طالب علمی میں شروع کی اور مرزا ارشد گورگانی اور داغؔ دہلوی سے اصلاح کی۔ بعد میں اپنی راہ خود بنائی۔ طالب علمی کے زمانے میں مشہور انگریز پروفیسر آرنلڈ سے فلسفہ پڑھا۔ ایم۔ اے کے بعد گورمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1905ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ کیمرج یونیورسٹی میں بغرضِ تعلیم داخلہ لیا اور تین برس تک علوم وفنون میں کمال حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور اپنی شاعری کے ذریعے ملک وقوم کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔

اقبالؔ کی قومی و وطنی نظموں میں بھی ایک نئی روح اور نہایت شدید جذبۂ خلوص موجود ہے۔ جس کہ وجہ سے اقبالؔ اس قدر مقبول ہوئے کہ بچے بچے کی زبان پر ان کی نظمیں چڑھ گئی۔ مندرجۂ ذیل نظم میں اقبال نے فلسفہ کی حقیقت بیان کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ عقلی کاوشوں یا موشگافیوں کا دوسرا نام ہے اور وہ عقل حرف اَرباب جنوں یعنی عاشقان حق کے حلقہ میں بیٹھنے سے پیدا ہوسکتی ہے جو حق و باطل میں امتیاز کرسکتی ہے۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گُہر سے!

پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں سے
وہ عقل کہ پاجاتی ہے شعلے کو شرر سے

جس معنی پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

الفاظ و معانی

خفی پوشیدہ، چھپا ہوا **جلی** روشن، واضح **صدف** سیپ **شرر** چنگاری **تصدیق** سچ ہونے کی تائید **تابندہ** چمکتا ہوا، روشن **نزع** جان کنی، دم توڑنا **غواص** غوطہ لگانے والا

مشق

.1 مندرجہ سوالات کے جواب ایک جملے میں لکھیے :

(1) مرد قلندر کی نگاہ سے کیا بات چھپی نہیں ہے؟

(2) عقلمند لوگ کس بات پر الجھتے نہیں ہیں؟

(3) کون سی چیز تابندہ گوہر سے بھی انمول ہے؟

.2 سمجھائیے :

(1) الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے!

(2) پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے

●

10 بھابھی جان

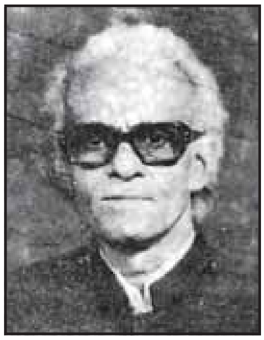

سہیل عظیم آبادی

پیدائش : 1911ء وفات : 1979ء

اصل نام سید مجیب الرحمٰن ہے لیکن سہیل عظیم آبادی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

سہیل عظیم آبادی یکم جولائی 1911ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت بہار میں چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے بہت سے گھرانے تھے۔ ان کی پیدائش ایسے ہی خاندان میں ہوئی۔ ابھی وہ ایک سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور پرورش نانیہال میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم نانیہال میں ہوئی۔

سہیل عظیم آبادی نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی اور سری نگر چلے گئے۔ پھر وہ پٹنہ چلے آئے اور یہیں سے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ رسالے نکالے، ایک روز نامہ اخبار ''ساتھی'' کا اجرا کیا۔

سہیل عظیم آبادی زندگی بھر اردو کی ترویج و اشاعت میں لگے رہے۔ ان کی شہرت ''الاؤ'' کے اشاعت کے ساتھ ہوئی اور پھر اس کے بعد بڑھتی ہی چلی گئی۔ مجموعہ 'الاؤ' 1940ء میں مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ان کے پہلے مجموعہ 'الاؤ' میں سولہ افسانے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ سہیل عظیم آبادی کا فن 'الاؤ' ''دو مزدور'' 'اسٹیشن پر' 'عجائب خاں' 'بھابھی جان' 'بدصورت لڑکی' 'گرم راکھ' 'بھوک' اور 'ناک' وغیرہ افسانوں میں ابھر کر آتا ہے۔

جب رقیہ بھابھی یاد آتی ہیں تو میرا سر خود بخود احترام سے جھک جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات سراپا روشنی ہے۔ ان کی یاد کے ساتھ مجھے وہ شمع یاد آجاتی ہے، جو کلیسا کی اونچی قربان گاہ پر جلتی اور پگھلتی رہتی ہے اور جب پادری عبادت ختم کرکے قربان گاہ سے اتر جاتا ہے تو وہ بھی خاموش زبان سے خداوند یسوع مسیح کا پیغام سناتی رہتی ہے جو دوسروں کے گناہ بخشوانے کے لیے صلیب پر چڑھایا گیا، مگر جو اب تک زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا اور سب کو نجات دلائے گا۔

رقیہ بھابھی کی ذات مجھے ایسی ہی شمع نظر آتی ہے جو جلتی اور پگھلتی رہتی ہے، لیکن شمع روشنی پھیلاتی اور زبان سے کچھ کہے بغیر ہر وقت ایک پیغام سناتی رہتی ہے۔ ایسا پیغام جو امر ہے اور جو ساری دنیا کو روشن کرنے والا ہے۔

بھابھی جان نے سویرے آواز دی۔

''خیر تو ہے شہزادے گھوڑے بیچ کر سوے ہو۔ چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔''

آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا، وہ مسکرا دی اور بولیں۔

''یعنی یہ بات کہ ٹھنڈی چائے مجھ سے نہیں پی جاتی اور بچوں کو اسکول بھیجنا بھی ہے۔''

''بھابھی یہی تو مصیبت ہے آپ کے ساتھ، صبح ہوئی اور اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہم لوگوں کو بھی آپ طالب علم ہی سمجھتی ہیں۔''

بھابھی بولیں۔

''تو آج تم کون بوڑھے ہو چکے ہو۔ بھئی اٹھو جلدی کرو۔''

بھابھی نے زور سے ہاتھ پکڑ کر بستر سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر کھڑا ہوگیا۔ وہ ہنسنے لگیں۔ میں بولا۔

''شکر ہے میں آپ کا اسٹوڈنٹ نہیں رہا۔''

''باتیں نہ بناؤ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے بچے بیٹھے ہیں۔''

''لیکن مجھے نیند آرہی ہے۔ رات بھر نہیں سو سکا۔''

میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''چائے پینے کے بعد دوسری قسط سولینا۔''

بھابھی جان بولیں۔ میں قسط کا لفظ سن کر ہنس پڑا۔ وہ بولیں۔

"شاعر ہوکر داد نہیں دیتے۔ کیا لفظ میں نے استعمال کیا ہے اگر نوابان اودھ باقی ہوتے تو اسی ایک لفظ کے استعمال پر ایک جاگیر تو بخش دیتے۔ چلو بھئی تم ذرا جلدی کرو۔ اتنا ہی سہی۔''

اور بھابھی جان کھانے کے کمرے میں چلی گئیں اور جب تھوڑی دیر بعد میں پہنچا تو بچے چائے ختم کررہے تھے۔ ننھی ریحانہ بولی۔ ''چچا جان ہم لوگ چائے ختم کر چکے۔ اب ہماری جھوٹی چائے پیجئے؟''

اسکول کی بس نے ہارن بجایا۔ بچیاں تالی بجاتی باہر چل دیں۔ بھابھی جان نے چائے پیالی میں انڈیل کر میری طرف بڑھائی اور بولیں ''اگر تم نوجوان اتنی دیر تک سوتے رہوگے تو کیا کرو گے؟''

''شعر کہوں گا اور کیا کروں گا۔''

بھابھی جان معنی خیز انداز میں مسکرائیں میں جھینپ گیا۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی نرمی اور مٹھاس اور بہت دور تک اشارہ۔ وہ آتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے بھائی جان ٹھیک چار بجے اٹھ بیٹھتے تھے اور چائے پی کر کام شروع کردیتے تھے۔ شروع میں تو مجھے بھی بڑا جبر ہوتا تھا لیکن آج صبح اٹھنے کی عادت کام آرہی ہے۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بھابھی جان کی میز پر ننھے بھائی کی خوب صورت سی رنگین تصویر رکھی ہوئی ہے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس تصویر کے پاس بھابھی جان اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ اب سنگار میز نام کا تھا اس پر بچوں کی کتابوں کا ڈھیر تھا اور شاید ایک کنگھی کے علاوہ سنگار کی کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ بھابھی جان اداس ہوگئیں اور بولیں۔

''نہ جانے تمہارے بھائی جان کس حال میں ہیں دیکھو ان کے مقدمے کا کیا ہوتا ہے ہزار میل کی دوری پر ان کے کوئی کام بھی نہیں آسکتی۔ چند ہی دنوں میں ان کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔''

بھابھی جان جو ہمیشہ پھول کی طرح کھلی رہنے اور بلبل کی طرح چہکتے رہنے کی عادی تھیں، بالکل اداس ہوگئیں۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ ذرا دیر میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر آوازی آئی۔

''میں آسکتی ہوں۔''

''آجاؤ۔''

بھابھی جان نے کہا اور ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابھی جان نے دیکھتے ہی کہا۔

''آؤ شمّی چائے پیو۔ میں آج شام کو تمہارے گھر جانے والی تھی۔ بُن دیا تم نے سوئٹر؟''

''وہی لے کر آئی ہوں۔ اون بچ گیا تھا تو میں نے ٹوپی اور موزے بھی بُن دیے۔''

''بہت اچھا کیا تم نے لو چائے پیو۔''

اور چائے کی پیالی شمّی کے آگے بڑھا دی۔ شمّی میری موجودگی میں کچھ شرما رہی تھی۔ بولی۔

''میں چائے پی چکی ہوں۔''

''پھر بھی پی لو۔ شرماتی کیوں ہو یہ ہیں مشہور شاعر اختر۔ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔''

میں ناشتہ ختم کرچکا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں بھی ذرا شہر سے ہو آؤں۔''

جاؤ۔ جاؤ میں بھی ذرا اسپتال سے ہو آؤں۔ چلو شمّی تم بھی ساتھ چلو۔''

میں نے کمرے کی کھڑکی سے بھابھی جان کو جنگلے کے احاطے سے باہر جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کی وہ بوتل تھی جو دیر سے میز پر رکھی تھی۔ یہ تو مجھے دو دن بعد معلوم ہوا کہ بھابھی جان کے ایک پُرانے ملازم کی بیٹی اسپتال میں ہے دو مہینے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کو بچہ پیدا ہوا ہے اور کوئی دیکھنے والا نہیں۔ بھابھی جان خود ہی دو فرلانگ دونوں وقت پیدل جاتیں اور دودھ پہنچاتی ہیں اور سوئٹر اور موزے اسی بچے کے لیے بنوائے تھے کیوں کہ سردی کا موسم شروع ہونے والا تھا اور شمّی ان کے کالج کی غریب طالب علم تھی جو صرف ان کی مدد کے سہارے پڑھ رہی تھی۔

بھابھی جان سے میری دوسری ملاقات تھی۔ البتہ خط و کتابت تھی، لیکن تین دن ساتھ رہ کر معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں مشین تھیں۔ صبح اٹھ کر کام شروع کردیتی تھیں۔ ان کا زمانہ بدل چکا تھا۔ کبھی چار پانچ نوکر اور مامائیں ہوتی تھیں۔ اب ان کے پاس صرف ایک نوکر تھا۔ جو بازار سے سودا لاتا اور کھانا بھی پکاتا تھا۔ رپوں کی تنگی تھی۔ پہلے ہزار روپیہ اپنے شوق پر خرچ کردیا کرتی تھیں۔ اب چار سو روپیہ ماہوار پر لڑکیوں کے ایک کالج میں لیکچرر تھیں اور پچاس روپیہ ماہوار ایک لڑکی کو پڑھانے کے ملتے تھے۔ لے دے کر یہی ان کی آمدنی تھی اور خرچ اپنی جگہ پر تھا بلکہ زیادہ ہی اپنا اور بچوں کا خرچ ہوتا تو کسی طرح پورا ہوجاتا لیکن خرچ بڑھ گیا تھا۔ بچوں اور اپنی ضرورتوں کے علاوہ ایک مستقل رقم انہیں ہر مہینہ مزدوروں اور طالب علموں کی انجمنوں کو دینی پڑتی تھی۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کے لیے سفر میں ریل کا کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ دو غریب لڑکیاں صرف ان کی مدد سے پڑھ رہی تھیں۔

بھائی جان کی شادی جب رقیہ بھابھی سے ہوئی تھی تو ہم لوگوں کا خیال تھا کہ شادی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک طرف ننھے بھائی تھے جن کو ایسی سیاست کا شوق تھا جو بار بار انہیں جیل بھجوایا کرتی تھی۔ دوسری طرف بھابھی جان تھیں جو نازوں کی پالی تھیں اور ایسے ماحول میں بڑھ کر جوان ہوئیں تھیں جس میں اپنی ہی ذات سب کچھ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بھائی جان بھی

سیاست کے چکر سے نکل کر بیرسٹری کریں گے۔ اپنی عالی شان سے کوٹھی میں شان کی زندگی گزاریں گے۔ یا پھر آرام کرسی والی سیاست چلے گی اور کتابوں کی باتیں دہرائی جائے گی۔لیکن سب کا خیال غلط نکلا۔ بھائی جان نے جلدی رقیہ بھابھی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ قدم بہ قدم ان کے ساتھ چلنے لگیں۔ شادی کے تین مہینے میں ہی ننھے بھائی گرفتار ہوگئے اور انہیں دو سال کی سزا ہوگئی۔ بھابھی جان نے اپنے راہ تلاش کرلی۔ بی۔ اے۔ وہ پہلے ہی کرچکی تھیں۔ جلد ہی تیاری کرکے ایم۔ اے کرلیا اور کالج میں لکچرر ہوگئیں اور اکلوتی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

دو سال بعد جب ننھے بھائی جیل سے چھوٹ کر آئے تو پھر اپنی سرگرمیوں میں لگ گئے اور بھابھی جان کام کرتی رہیں۔ دو بچے ہوئے انہیں پالتی رہیں۔ اب ننھے بھائی تین سال سے بند تھے اور ان پر مقدمہ چل رہا تھا تو بھابھی جان بے شمار ذمہ داریوں اورغم کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھیں، لیکن ان کا چہرہ کبھی میلا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے غم کو مسرت سمجھنے لگیں ہیں اورغم میں خوشی کا پہلو نکال لیتی ہیں۔

وہ صبح سویرے اٹھتیں۔ بچوں کو نہلاتیں، ان کے کپڑے بدلتیں، خود نہا دھوکر تیار ہوجاتیں۔ بچوں کو کھا پلا کر سات بجے اسکول بھیج دیتیں۔ پھر ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ طرح طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے اورطرح طرح کی فرمائشیں کرتے۔ کوئی ان سے ملازمت کے لیے سفارش کرنے کو کہتا کوئی کسی کام کے لیے۔ سب آدمی انہیں بڑے آدمی کی بیوی اور بہو سمجھتے تھے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ان کا تعلق اب بڑے لوگوں سے صرف چھوٹے لوگوں کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ وہ بڑے لوگوں کے پاس اب صرف سفارش لے کر جاتی ہیں۔ ورنہ اب ان سے دور کا واسطہ نہیں رہ گیا ہے۔ بھابھی جان کالج جاتیں اور وہاں ہر لڑکی کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتیں۔ کالج سے واپس آکر کئی خط ہر روز لکھتیں اور انہیں ڈاک میں ڈلواتیں۔ عام طور پر خطوط نئے لکھنے والوں کے نام ہوتے جو انہیں خط لکھا کرتے تھے۔ بھابھی جان نے محض دل بہلانے اور وقت کاٹنے کے لیے لکھنا شروع کیا مگر وہ بہت اچھا لکھنے لگیں۔ نئے لکھنے والے ان سے مشورہ طلب کرتے اور وہ بڑی محبت کے ساتھ ان کے خطوط کے جواب دیا کرتیں۔ اس طرح کہ نئے لکھنے والے نہ تو غلط فہمیوں کا ساتھ ان کے خطوط کے جواب دیا کرتیں۔ اس طرح کہ نئے لکھنے والے نہ تو غلط فہمیوں کا شکار ہوکر بہک سکیں اور نہ ان کی دل شکنی ہو۔ پھر شام کو ایک جگہ پڑھانے چلی جایا کرتی تھیں۔

یعنی صبح جاگنے کے بعد سے سوتے وقت تک کام۔ آدمی کا ہے کو مشین معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے خط لکھنے کے شوق سے تنگ آکر میں نے کہا۔

''بھابھی جان آپ نے کیا علّت پال رکھی ہے۔ کالج میں تو سر کھپاتی ہی ہیں گھر پر بھی ایک کالج بنا رکھا ہے۔'' بھابھی جان بڑے باوقار انداز میں مسکرائیں اور بولیں۔

''اختر، ان نئے لکھنے والوں کو کیسے بھول سکتی ہوں یہ تو ہمارے مستقبل کی امید ہیں۔ اگر میں ان پودوں پر روز چھڑکاؤ نہیں کرسکتی، ان کی خدمت نہیں کرسکتی کہ ان میں پھول لگیں اور سارا باغ مہک اٹھے تو کم سے کم جو کچھ کرسکتی ہوں وہ تو کرنا ہی چاہیے۔''

اس جواب کے بعد کچھ اور بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں چپ ہورہا۔

دوسرے دن شام کے وقت وہی لڑکی شمّی ان کے پاس آئی۔ وہ بہت اداس تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ بول نہیں رہی تھی۔ بار بار اس کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رودے گی۔ بھابھی نے اسے بٹھایا اور باتیں کیں۔ پھر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ نہ بولی۔ بھابھی جان جتنے اصرار کے ساتھ اس سے پوچھتیں معلوم ہوتا کہ اس کے ہونٹ اتنی ہی شدت کے ساتھ آپس میں چپکتے جاتے تھے۔ آخر وہ کچھ نہ بولی۔ بھابھی جان نے اسے اٹھایا اور سونے کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور پوچھا کیا بات ہے۔

لیکن شمّی کچھ بتانے کے بدلے رونے لگی۔ بھابھی جان کے چپ کرانے پر بھی روتی گئی اور بڑی دیر کے بعد بھابھی جان کے ڈانٹنے پر اس نے بتایا کہ دوسرے ہی دن اس کے بھائی کو ایم۔ اے کی فیس داخل کرنی ہے اور روپیہ کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا ہے۔ وہ اس بات پر شرمندہ ہے کہ بھابھی جان اس کے کالج کا خرچ دیتی ہیں اور اب وہ بھائی کے امتحان کی فیس مانگے۔ لیکن دوسرا کوئی ایسا ہمدرد بھی نہیں تھا جس کے سامنے جاکر وہ اپنا بوجھ ہلکا کرتی۔ وہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے ان کے پاس آئی تھی۔

بھابھی جان نے بڑی محبت سے اس کے گال پر ایک چپت لگائی اور بولیں۔

''پگلی اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ شرمانے کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ اسی طرح تو ایک دوسرے سے کہہ کر اپنا دکھ درد ہلکا کرتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے الماری کھولی اور سونے کی دو چھوٹی چھوٹی چوڑیاں شمّی کے ہاتھ میں دے کر بولیں۔

''...... جاؤ اسے بیچ کر فیس جمع کردو۔''

شمّی شاید گرجاتی۔ لیکن بھابھی نے اسے سنبھال لیا اور اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔

''سدا ہی ایسا زمانہ نہیں رہے گا، دن بدلیں گے، جاؤ سویرے چلی جاؤ، پھر اندھیرا ہوجائے۔''

شمّی چوڑیاں لے کر چلی گئی۔ یہ چوڑیاں وہ تھیں جو دو دن پہلے بھابھی جان نے ننھی ریحانہ کے لیے بڑی مشکل سے پیسے بچا کر بنوائی تھیں اور ریحانہ نے انہیں صرف ایک بار پہنا تھا۔

چوڑیاں دے کر بھابھی جان خوش تھیں جیسے ان کے دل پر سے پہاڑ جیسا کوئی بوجھ اتر گیا۔

میں چار دنوں سے ان کے پاس تھا۔ ایک ضروری معاملے میں ان سے مشورہ کرنے گیا تھا لیکن ان کی مصروفیتیوں اور الجھنیں دیکھ کر باتیں کرنے کا موقع نہ ملا اور نہ ہمت ہوسکی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان سے بغیر مشورہ کیے اور مدد مانگے چلاؤں گا حالانکہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ صرف وہی ایسی آدمی تھیں جو اس سلسلے میں میری مدد کرسکتی تھیں لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ان سے اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کروں گا۔

بھابھی جان نے خود ہی کہا۔

''تم چار دنوں سے آئے ہوئے ہو لیکن کوئی بات نہیں کی۔''

میں نے کہا